Fikr-o-Nasar (Islamabad) 14:9(1977)

نبوت، وجدان، اور اجتہاد

منظور احمد

لفظ اور معنی کے ربط کا مسئلہ ایک قدیم اور عمیق مسئلہ ہے۔ لفظ سے ہماری روشناسی معنی کی ترسیل کے ایک وسیلہ کی حیثیت سے ہے۔ اگرچہ ہماری فکر کا ایک بڑا حصہ لفظ کے ما بعد الطبیعاتی رموز سے بحث کرتا ہے۔ لیکن ما بعد الطبیعات کی اس منزل پر پہنچ کر لفظ اور معنی میں ایک ایسی عینیت مطلقہ پائی جاتی ہے جہاں ان دونوں کی تقسیم خود بے معنی ہوجاتی ہے۔ اس لئے الفاظ اور معانی کا ربط و تعلق مظاہر کی سطح پر قابل فہم ہوتا ہے۔ اور حقیقت کی سطح پر لفظ خود حقیقت یا حقیقت خود لفظ ہو جاتی ہے۔ اور اس سے روشناسی کا ذریعہ پھر الفاظ نہیں ہوتے بلکہ کسی طور کا عقلی وجدان ہوتا ہے۔ حقیقت نبوت کے متعلق گفتگو بالعموم اور حقیقت محمدیہ کے متعلق بالخصوص اسی وجہ سے ایک ایسی سطح معرفت سے تعلق رکھتی ہے۔ جہاں حقیقت مطلقہ بے تغیّر ہے اور اس کو ثبات دوام حاصل ہے۔ یہ فکر اگرچہ ہماری اس معروف فکر سے متضاد معلوم ہوتی ہے، جس کو اقبال کے فلسفہ کی بدولت اس اسلامی برصغیر میں رواج حاصل ہوا۔ لیکن ذرا گہری نظر سے دیکھنے پر پتہ چلتا ہے کہ یہ تضاد خود الفاظ اور زبان کے پیدا کردہ ان گورکھ دھندوں میں ایک ہے جس کو نہ یونانی فکر حل کر سکی اور نہ مغرب کا جدید فلسفہ۔ فکر و فلسفہ اور مذہب، خاص طور پر وہ مذاہب جن

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

کو ہم کتابی مذاہب کہتے ہیں، یعنی یہودیت، عیسائیت اور اسلام۔ کسی نہ کسی طور پر یونانی فکر اور فلسفہ جدید سے خلط ملط ہوئے اور ان کے آپس کے ربط و تعلق سے فہم مذہب کے لئے مختلف تعقلات نے جنم لیا۔ اس وقت میری بحث نہ ان تعقلات سے ہے جو مغرب کے فلسفہ جدید کی پیداوار ہیں نہ یونانی فکر کی نارسائی سے، اور نہ ہی حقیقت کے اس درجہ سے ہے جہاں الفاظ اور معنی میں عینیت ہوتی ہے۔ بلکہ حقیقت نبوت محمدی (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) کے اس پہلو سے ہے جہاں ہم ایک فکری وجود کی حیثیت سے مظہر نبوت سے بحث کر سکتے ہیں۔ موضوع کو اس طرح برتنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ عصر حاضر کے تعقلات اس مابعد الطبیعاتی حقیقت کے فہم سے گریز پا ہیں۔ جہاں ''حقیقت''، لفظ اور معانی کی عینیت مطلقہ بن کر عقلی وجدان کا موضوع بن جاتی ہے لیکن دوسری اہم اور بڑی وجہ یہ ہے کہ منصب نبوت عموماً اور منصب محمدی خصوصاً اس فہم خاص کو ملتزم نہیں ہے۔ اور صاحب شریعت کے چار مقاصد ، یعنی تلاوت آیات۔ تزکیۂ نفس۔ علم کتاب اور حکمت ہیں درجہ حکمت اگرچہ حقیقتاً کتنا ہی اول کیوں نہ ہو درجۂ زمانی میں آخری ہے۔ لیکن خود حکمت کے دو مفہوم ہوسکتے ہیں۔ ایک حکمت حقیقت وجود اور دوسری حکمت مظہر وجود۔ عصر حاضر مظہر وجود کی حکمت کی فہم یہی حقیقت وجود کی حکمت سے زیادہ سریع الحس ہے۔ اس لئے ہماری گفتگو کا محور یہی حکمت مظہری ہے۔

عصر حاضر کے تعقل کے متعلق یہ بات کس کو معلوم نہیں۔ وہ ایک خاص قسم کی ارتیاب اور تشکیک کا شکار ہے۔ یہ تشکیک عمومی بھی ہے اور خصوصی بھی۔ عمومی تشکیک کی وجہ یہ ہے کہ وہ باتیں جو کسی زمانہ میں صرف خواص کا حصہ تھیں اب وسائل ابلاغ میں انقلاب کی وجہ سے عوام تک پھیل چکی ہیں اور وہ سوال اور بحثیں جن کے لئے زمانہ قدیم میں علم فضل دونوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ اب زبان زد خاص و عام ہیں۔

سوال اور تشکیک آسانی سے پھیلنے والی باتیں ھیں۔ یقین اور ایمان کی متاع ارزاں نہیں ھے۔ خصوصی تشکیک کی وجہ علوم کا وہ ارتقاء ھے جو یورپ میں نشأۃ ثانیہ کے زیر اثر ھوا۔ اس پر مزید سائنسی اور تکنیکی علوم کی وہ ترقی ھے جو اس صدی کا خاص حصہ ھے۔ اس ترقی نے انسانی ذھن پر اور اس کی سوچ پر گہرا اثر ڈالا اور اس کے ساتھ ھی اس کا طرز زندگی بالکل بدل کر رکھ دیا۔ ٹکنالوجی کے زیر اثر طرز زندگی کی تبدیلی سے انسانی اقدار، اس کا نقطۂ نظر، اس کی فکر، غرض ھر چیز میں ایسی تبدیلی آئی جس کو اھل مذاھب دیکھتے ھی رہ گئے اور ایسا معلوم ھونے لگا کہ گویا زندگی کا یہ انقلاب مذھبی حقیقتوں کو گرد راہ کی حیثیت سے بہت پیچھے چھوڑ آیا ھے۔ مسلمانوں کی بدقسمتی کہ انھوں نے دوسرے اھل مذاھب سے سبق حاصل نہیں کیا اور ان تعقلات کی جانچ پڑتال نہیں کی جن کو دوسرے اھل مذاھب نے مذھبی تصورات کی حفاظت کے لئے پچھلے تین چار سو برسوں میں استعمال کیا ھے اور جنھوں نے مذھب سے زمانہ حاضر کی رجعت قہقری میں اس کا ساتھ نہیں دیا۔ آج ھم ان ھی تعقلات کو ابدی حقیقتوں کا روپ سمجھ کر فہم مذھب میں استعمال کرنے کے درپے ھیں اور یہ تعقلات تیزی سے اور متوقع طور پر ھمارا ساتھ چھوڑ رھے ھیں۔

نبیوں کے پیغام کا ذریعہ الفاظ ھوتے ھیں۔ حضورؐ کے پیغام کا وسیلہ وہ الہامی کتاب ھے جس کو قرآن مجید کہتے ھیں اور وہ ھدایات ھیں جن کو حدیث رسولؐ کے نام سے موسوم کیا جاتا ھے۔ دونوں الفاظ کا مجموعہ ھیں اور لفظوں کے معنی کسی لغت کی کتاب میں نہیں ملتے۔ اس لئے کہ اس میں تو لفظ کا بدل دوسرے لفظ ھوتے ھیں۔ پیغام رسالتؐ کے اصل معنی اس رشتہ میں ملتے ھیں جو کتاب اور صاحب کتاب کے مابین ھے۔ سیرت رسولؐ، پیغام رسولؐ کے معنیٰ ھیں اور اس کے بغیر قرآن کے الہامی مفاھیم تک رسائی نہیں ھوسکتی۔

سیرت و کردار اور الفاظ کے اس ربط کی طرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ پہلا خطبہ اشارہ کرتا ہے جو آپ نے اہل مکہ کے سامنے دیا۔ پہاڑ کی بلندی پر کھڑے ہوکر پہاڑ کے دوسری طرف کے واقعات کا مشاہدہ ایک ایسی تمثیل ہے، جس کو چشم دانائی صرف عمل رسول کی معرفت سمجھ سکتی ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں ایمان اور عمل صالح میں جس داخلی ربط کا بار بار اشارہ کیا گیا ہے وہ بھی اس حقیقت کا غماز ہے کہ کیفیت ایمانی کی فہم اور اس کی حقیقت کی معرفت عمل انسانی کے ذریعہ ہوتی ہے۔ کیفیات بلا عمل ہونا معلوم، لیکن ان کی فہم بلا عمل ناممکن ہے۔ عمل ہی ابلاغ کا ذریعہ ہے اور عمل ہی معنی کی ترسیل میں آتا ہے۔ الفاظ اور عمل کا یہ ربط جو سیرت رسول‌ؐ نے ہم پر آشکار کیا ہے نبوت کی دوسری بڑی حقیقتوں کی پردہ کشائی کرتا ہے۔ عالم مظاہر کی حقیقت تغیر اور نمو ہے۔ تغیر اور نمو کے رک جانے کا نام موت ہے اور یہ موت جس طرح ذی حیات کے لئے ہے اسی طرح تصورات عقائد اور علم اور ایمان کے لئے بھی ہے۔ انسانی اعمال کی تبدیلی کے ساتھ انسانی فہم بدلتی ہے اور الفاظ کے معنی بدلتے ہیں۔ جو لفظ آج ہم بولتے ہیں اس کے معنی بظاہر وہی ہوتے ہیں اور بڑی حد تک وہی ہوتے ہیں جو آج سے ہزار سال قبل تھے۔ لیکن ایک بڑی اہم حد تک بدل بھی چکے ہوتے ہیں۔ لغت پر بھروسہ اور لفظ کو عمل سے کاٹ دینے کی عادت کی وجہ سے ہم اکثر الفاظ کی معنویت کی ہمیشگی پر زیادہ نظر رکھتے ہیں اور ان کے تغیر اور نمو کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ معاشرتی زندگی کے واسطے سے الفاظ کے معنی میں ہم یہ تغیر بچشم سر دیکھ سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ماہرین لسانیات اور مفکرین، الفاظ اور معنی کی بحث میں کسی لفظ اور کسی تصور کے تاریخی ارتقاء سے واقفیت حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اب اگر پیغام رسالت الفاظ کے ذریعہ ہے اور الفاظ کے جاننے کا ذریعہ عمل ہے، تو آج اس عمل کو ہم کس طرح جان سکتے ہیں جسکا عامل ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ کیا ہم ماضی کے کسی

تہذیبی مقام کی اسی طرح معرفت حاصل کر سکتے ہیں جس طرح آج ہم اپنے تہذیبی حال سے واقف ہیں؟ کسی ثقافت اور تہذیب کو کیا، اس زندہ مشاہدہ کے بغیر سمجھنا ممکن ہے۔ جو اس تہذیب میں رہ کر حاصل ہوتا ہے۔ الفاظ اور بیان، کسی بھی زندہ تہذیب کے عکاس اس لئے نہیں ہوسکتے کہ الفاظ کے ساتھ عمل کا جو ربط تھا وہ تاریخ نے توڑ دیا ہے اور آج کا لفظ آج کے عمل سے مربوط ہے اور آج کا عمل کل کے عمل سے مختلف ہے۔ الفاظ اور تصورات کے ارتقاء کی تاریخ اگرچہ کسی حد تک مرتب ہوسکتی ہے لیکن جب بعد زمانی بڑھتا ہے تو تاریخ کے دو سروں پر کھڑے دو اشخاص کے مابین فہم کا ایک رسمی رشتہ تو قائم رہتا ہے لیکن حقیقی رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس خلا کو پر کرنے کے لئے جن دو چیزوں کی ضرورت ہے وہ رسول کریم علیہ الصلاۃ والسلام کی سیرت مبارکہ سے ہمیں اس طرح ملتی ہے، جیسے پہلے کبھی نہیں ملی تھیں۔ اس سیاق میں اگر آپ ختم نبوت کے مسئلہ کو دیکھیں تو اس کی بنیادی اہمیت بھی آپ پر آشکار ہو جائے گی۔ نبوت اس لئے ختم نہیں ہوئی کہ تہذیب اپنے ارتقاء کے مراحل طے کرتی ایک ایسے مقام پر آچکی تھی جہاں ایک نبی کے پیغام کو حفاظت سے رکھنے اور اس کو نسلاً بعد نسلٍ منتقل کرنے کے ذرائع پیدا ہو چکے تھے۔ اگر وجہ صرف یہی ہوتی تو چھٹی صدی سے زیادہ بیسویں صدی کو یہ حق حاصل ہوتا کہ نبی آخرالزمان ؐ اس میں معبوث ہوتے۔ کسی پیغام اور الفاظ کے کسی مجموعہ کو محفوظ کرکے آگے پہنچا دینے سے ان کے معنی آگے نہیں پہنچتے۔ الفاظ معنوں کے بوجھ سے، لمبی مسافت طے کرتے ہوئے شکست و ریخت کا شکار ہو جاتے ہیں اور وہ اس مفہوم تک انسان کو نہیں پہنچاتے جو صاحب لفظ کا منشاء ہوتے ہیں۔

میرے نزدیک ختم نبوت کا منشا ایک تو اس وجدان کو عام کرنا تھا جس کو آپ مذہبی وجدان کہہ سکتے ہیں اور جس کے لئے معیار کی حیثیت سے

نبی برحق کا وجدان آپ کی رہبری کرتا ہے ۔ اور دوسرے اس اجتہاد کو عام کرنا تھا ۔ جو زندگی کے راست مشاہدہ کو سامنے رکھتے ہوئے ان تعقلات کی نمو کا ذمہ دار ہو، جو نبی برحق ؐ نے آج سے چودہ سو سال قبل قائم کئے تھے ۔ یہ دونوں چیزیں ہم کو ماضی سے جوڑتی ہیں اور اس تہذیب و تمدن کی فہم و معرفت فراہم کرتی ہیں جو اس سے قبل گزر چکی ہے ۔ مشاہدہ کی عموبیت سے میری مراد کسی حد تک وہ شے ہے جس کو ارباب معرفت ولایت کہتے ہیں ۔ اگرچہ اس میں سے بعض ولایت کو حقیقت کے غیر لفظی وجدان سے آگے کچھ نہیں سمجھتے اور مشاہدہ اور لفظ کے درونی رشتے جو لازمی رشتے ہیں ان کی نظر سے اوجھل ہیں ۔ اور انھوں نے اس حقیقت کو بھی نظر انداز کیا ہے کہ ولایت کی عموبیت کے ساتھ ساتھ اجتہاد کی رسائی بھی وسیع کردی گئی ہے اور یہ دونوں اصول مل کر ہی اسلامی معاشرہ کی حیات اور اس کی نشوونما کے ضامن بن سکتے ہیں ۔ صرف کسی ایک اصول پر قائم رہنے سے اسلام کی حیات اجتماعی یک رخی طور پر تو ترقی کر سکتی ہے لیکن اس تہذیب کی عکاس نہیں ہوسکتی جس کو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں قائم کیا تھا ۔ مذہبی وجدان کی یہ عموبیت جس کا معیار پیغمبرانہ وجدان ہو خدا کی وہ امانت ہے جس کے زمین و آسمان متحمل نہ ہوسکے اور جس کو بالآخر انسان کے ناتواں کندھوں نے اٹھایا ، لیکن نبی آخرالزماں کے آنے تک اس وجدان کو وہ مہر توثیق نہ ملی تھی جو حضور ؐ نے اس کو عطا کی ۔ انسانی وجدان اب خاتم النبی کی توثیق سے اس حقیقت کا راست متحمل ہو سکتا ہے جس کے پہلے انبیاء متحمل ہوا کرتے تھے ۔ دوسرے الفاظ میں امت محمدی کے وہ تمام لوگ جو اس وارثت کے امین ہو سکتے ہیں اپنے اپنے درجہ اور مقام میں نبوت کی ان خصوصیات کے حامل ہیں جو حضور ؐ سے پہلے پیغمبروں میں مختص ہوا کرتی تھیں ۔ حضور ؐ کی ذات گرامی کا یہ وہ کارنامہ ہے کہ جس نے انسان کو انسانیت کی معراج پر پہنچایا اور چونکہ اب کوئی منزل انسانیت کی منزل کے ماورا نہیں ہے ، تکمیل دین کا اعلان کر دیا گیا ۔ اب انسانیت کی نمو اور ترقی کی

بنیاد یہ وجدان، حرکت کا یہ سرچشمہ اور یہ ذوق آگہی ہے۔ انسان اس وجدان سے ماورا کسی فرد کا محتاج نہیں ہے۔ اس کو اب صحیح اور غلط، قانونی اور غیر قانونی، اچھے اور برے، مفید اور غیر مفید میں امتیاز پیدا کرنے اور حکم لگانے کے لئے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ محمد عربیؐ سے توثیق شدہ وجدان اس کے لئے کافی ہے۔

یہ وجدان اپنے اظہار کے لئے جب معاشرتی عمل میں جنم لیتا ہے تو اس پر اگر ایک طرف اس عمل سے رہنمائی حاصل کرنے کی قید ہوتی ہے۔ جو خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل تھا، تو دوسری طرف اصول اجتہاد سے اس میں آزادانہ حرکت کا رجحان بھی پرورش پاتا ہے۔ اجتہاد ماضی سے بغاوت کا نام نہیں ہے۔ یہ انسانی کوششوں کو ایک تاریخی تسلسل سے مربوط کرنے کا ذریعہ ہے۔ ہر معاشرہ کے مابعدالطبیعاتی، سماجی، سائنسی اور عملی تعقلات چند خارجی اور داخلی اسباب کے امتزاج سے پیدا ہوتے ہیں اور معاشرہ کا عمل ان تعقلات کو معنی عطا کرتا ہے۔ اگر ہم تاریخ کے کسی دور کے تعقلات بعینہ قبول کرلیں تو ان کی مثال ایسی منجمد شبیہوں کی ہوگی جن میں زندگی کی حرارت اور حرکت موجود نہیں ہے۔ زمانہ کے ساتھ ان تعقلات کی تبدیلی سے ہم کو خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ یہ سمجھنے کی، کہ اگر آج ہم بعینہ اس تہذیبی حالت کو واپس نہیں لا سکتے جو اب سے ہزار یا دو ہزار سال پہلے قائم تھی تو کسی طرح اس معیار تک نہیں پہنچ سکتے جو ہم نے اپنے آئیڈیل کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے۔ تاریخ کے کسی حصہ کو منجمد کرکے موجودہ دور میں زندہ نہیں کیا جاسکتا۔ تہذیبی تشخص تبدیلیوں اور تغیرات کے باوجود اسی طرح برقرار رہتا ہے اور رہ سکتا ہے جس طرح انفرادی تشخص اگر ایک فرد اپنی عمر کے کسی حصہ میں اپنے ہر جز کو بدل کر بھی وہی فرد رہ سکتا ہے تو تاریخ کے اس تسلسل میں کوئی تہذیب اپنی روایتوں میں تبدیلیوں کے باوجود کیوں اپنا تشخص برقرار نہیں رکھ سکتی اجتہاد، عمومی

تصورات کی عالمگیریت کو برقرار رکھتا ھے اور خصوصی روایات کے تغیر کو بے جا نہیں سمجھتا ۔ تہذیب کے ہر دور میں عموسی تصورات کی ایک تفہیم کے انداز بدل سکتے ھیں اور بدلتے رھے ھیں ۔ اسلاسی فکر کی عظمت کا نشان یہی ھے کہ اس نے اس کائنات سے مقدس اور غیر مقدس کے فرق کو مٹا کر تمام وجود کو مقدس بنایا ھے اور اپنے وجدان کی تخلیقی صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے ہر دور میں فکر کی نئی راھیں وضع کی ھیں ۔ خاتم النبی‌ص ہونے کی حیثیت سے مذھبی وجدان کی بنیاد پر اجتہاد کی ذمہ داری وہ امانت ھے جو حضورص نے اپنی امت کے سپرد کی ھے اور خود اس پر عمل کرکے وہ شہادت دی ھے جس کا گواہ خود خدا ھے ۔

★ ★ ★